گفتگو وسیلۂ تفاہم واعتماد سازی

عصر حاضر کو علوم ومعارف کی روز افزوں ترقی کا دور کہا جاتا ہے اور ہر روز نئے علمی انکشافات اور اطلاعاتی تکنیک کی ترقی اور اس کی تیز رفتار وسعت نے نہ صرف اس وسیع و عریض دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے بلکہ پوری دنیائے بشریت کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔صورتحال یہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں رونما ہونے والی فکری اور ثقافتی تحریکوں کو اب ملکوں کی جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں کے درمیان محدود نہیں رکھا جاسکتا بلکہ یہ نئے افکار وعقائد نہایت تیز رفتاری اور غیر معمولی سرعت کے ساتھ دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہونچ جاتے ہیں اور ان علمی ایجادات کا جائز وناجائز استعمال شروع ہوجاتا ہے اور تاریخ بشریت گواہ ہے کہ علمی وسائنسی ایجادات وابتکارات کا جائز استعمال کم ہی کیا گیا بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کا ناجائز استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانی قدروں کی پامالی پر مشتمل قتل وغارتگری کی داستانوں کو تاریخ میں نمایاں جگہ نہ ملی ہوتی اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں زن ومرد اور بزرگوں ونونہالوں کو خاک وخون میں غلطاں کردینے والے حوادث رونما نہ ہوتے اور آج دنیا میں تباہی وبربادی پھیلانے والے اور انسانیت کو نابودی کے کنارے پر کھڑا کرنے والے مہلک اسلحوں کی فراہمی ودستیابی کے لئے بھاگ دوڑ نہ چل رہی ہوتی۔

لیکن یہ علمی ایجادات فقط منفی پہلوؤں کی حامل نہیں ہیں بلکہ اگر ان کے مثبت پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان ایجادات نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو عظمت وترقی سے مالامال کررکھا ہے۔ یہ انہیں علمی ایجادات کا کرشمہ ہے کہ آج ہفتوں کا سفر لمحوں اور گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے اور برسوں کے لاعلاج بیماریوں کا کامیاب علاج دستیاب ہے اور اعلیٰ انسانی قدروں پر مشتمل فکری، تہذیبی اور ثقافتی تحریکیں اپنے مشن کو پروان چڑھانے میں سرگرم ہیں۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق کی حفاظت، خواتین کے حقوق کی بحالی، آزادی اور عوام الناس کے حقوق کی فراہمی کا شور ہمہ وقت سنائی دے رہا ہے۔ ان حقائق وشواہد کی موجودگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر علمی وفکری ایجاد مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی حامل ہواکرتی ہے اور اصل کرشمہ تو ان کے تفاہم اوران کے درمیان

توازن کی ایجاد ہے جس کے ذریعہ اعتماد سازی کا مرحلہ طے کیا جاسکتا ہے اور اس اعتماد سازی کا بہترین اور موثر ترین وسیلہ گفتگو ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دنیا کے ہر گوشہ میں تناؤ بدگمانی، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارتگری اور تباہی وبربادی کا ماحول پایا جاتا ہے۔ یہ تناؤ انفرادی واجتماعی، علاقائی وملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر دکھائی دے رہا ہے اور انسانی دنیا غیر معمولی کرب وبے چینی میں مبتلا ہے اور شاید انہیں حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حکیم مطلق نے اپنی گرانقدر آسمانی کتاب قرآن مجید میں یہ ارشاد فرمایا ہے ''تَعَالَوا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ'' یعنی آیئے گفتگو کریں اور ایک مشترک بات یا پیغام پر متفق ہوجائیں۔ جی ہاں! موجودہ حالات میں بھی تہذیبوں، تمدنوں، ثقافتوں کے درمیان گفتگو کی افادیت سے انکار ناممکن ہے اور یہ کہنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو ضروری ہے تاکہ مختلف ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والوں کے درمیان آپسی میل جول اور باہمی احترام کو فروغ حاصل ہوسکے اور تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کی روک تھام کی جاسکے۔

جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی اور دینی تعلقات کی روایت بہت پرانی ہے اور دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان گفتگو کوئی نئی بات نہیں ہے اور اس سرزمین کی ثقافتی میراث اس شعبہ میں نہایت غنی اور گرانمایہ رہی ہے۔ نویں صدی ہجری میں کبیر جیسے نامور شاعر نے بھکتی تحریک کے سایہ میں یکتا پرستی اور تمام ادیان ومذاہب کے احترام کا پیغام دنیاوالوں کے سامنے پیش کیا۔ واضح رہے کہ اس زمانہ میں شہر جونپور کو دار العلم کی حیثیت حاصل تھی اور کبیر نے اسلامی علوم ومعارف میں اسی شہر سے مہارت حاصل کی تھی اور اسلامی عرفان وتصوف کے سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد ہی انہوں نے بنی نوع انسان کو محبت، انسان دوستی، اخوت وبرادری، مذہبی خرافات سے علیحدگی اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت وبندگی کے ساتھ ہی ساتھ دینی تعصب اور فرقہ واریت سے دوری اختیار کرنے کی دعوت دی تھی۔

قرون وسطیٰ کے دوران فارسی، ہندی، اردو اور ہندوستان کی دیگر مقامی زبانوں میں لکھے گئے اشعار میں ہندواور مسلمان شعراء انہیں افکار وعقائد کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم رہے اور ان کی اس مخلصانہ اور انسان دوستانہ تبلیغات کا اثر صرف عوام الناس تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اکبر اعظم جیسا جلیل القدر اور نامور بادشاہ بھی اس مکتب فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس وسیع ملک میں زندگی بسر

کرنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومی اتحاد اور باہمی میل ملاپ کو مزید مستحکم بنانے کے لئے اکبر اعظم نے اپنے دربار کے نامور وزیروں اور دانشوروں کی مدد بھی حاصل کی اور شیخ مبارک ناگوری، ان کے فرزند ابو الفضل علامی وفیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی اور فتح اللہ شیرازی جیسے علماء ومفکرین کی مدد سے ایک نئے مشرب ومکتب فکر کی شروعات بھی کی جس کا نام دین الٰہی اور جس کا مقصد ومحور ''صلح کل'' کا قیام تھا۔ اکبر کی اس تحریک میں مختلف ادیان ومذاہب کے نامور علماء مثلاً مسلمان، ہندو، عیسائی پادری،، زردشتی وید، ہندو برہمن یہاں تک کہ ملحد جماعت سے وابستہ لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تمام لوگ اکبر کے ''عبادت خانہ'' میں بیٹھ کر مختلف مذہبی موضوعات پر مناظرہ ومباحثہ کیا کرتے تھے اور اس گفتگو اور مباحثہ کا بنیادی مقصد گفتگو کے ذریعہ مختلف جماعتوں کے درمیان موجود غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے باہمی اعتماد واحترام کا ماحول پیدا کرنا تھا تاکہ انسان دوستی پر مبنی اس حقیقی الٰہی پیغام کو مقبول عام کیا جاسکے جس میں انسان کو اشرف المخلوقات اور لائق احترام قرار دیا گیا ہے۔ انسان کو انسان سے محبت کا درس دیا گیا نفرت وعداوت کا نہیں اور لوگوں کے درمیان دوستی اور میل ملاپ کی بات پرزور دیا گیا ہے دوری وعلیحدگی پر نہیں بلکہ مولانا روم کی زبان میں تو لوگوں کو در اصل وصل وملاپ کی طرف مدعو کرنے کے لئے پیغمبروں کو مبعوث کیا گیا ہے فاصلہ وجدائی پیدا کرنے کے لئے نہیں۔

تو برای وصل کردن آمدی
نی برای فصل کردن آمدی

انسان دوستی، باہمی احترام اور صلح کل جیسے آدرشوں پر مبنی یہ تحریک اکبر اعظم کے دور تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ملک گیر پیمانے پر تعمیر وترقی کے کاموں میں ہمہ تن سرگرم شاہجہاں کے فرزند ارجمند یعنی دارا شکوہ جیسے بعض شہزادوں نے بھی ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کی اس راہ و روش کو جاری رکھا۔ دارا شکوہ نے بذات خود سنسکرت زبان کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے ہندو مذہب کی مقدس کتاب اپنیشدوں کا فارسی زبان میں ''سر اکبر'' کے نام سے ترجمہ کیا اور اس کی تفسیر پر مبنی ''مجمع البحرین'' نامی رسالہ کی تالیف کا کام بھی انجام دیا جس کا مطلب ہوتا ہے دو دریاؤں کا سنگم اور دو دریاؤں سے مراد اسلام اور ویدائی ہندو مذہب ہے اور اس رسالہ میں دونوں مذاہب کے درمیان موجود مماثلتوں اور مشترک فکروں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

لیکن ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کے سلسلہ میں جس چیز کی طرف توجہ دینا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے مفہوم اور اس کی سرحدوں کا باقاعدہ تعین کردیا جائے کیونکہ اگر گفتگو کا مفہوم اور اس کی وسعت پوری طرح واضح نہ ہوئی تو اس کے خراب نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں داراشکوہ نے ادیان ومذاہب کی جو گفتگو چھیڑی تھی اس کی افسوسناک شکست اور ناکامیابی کی وجہ شاید اسی بات میں پوشیدہ تھی۔ درحقیقت گفتگو کا مفہوم پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ ہماری گفتگو اور مباحثہ وحدت (debate for unification) وصلح کل(universal peace) کے درمیان کیا فرق ہے؟ گفتگو کی ابتدا سے قبل مشابہ اصطلاحات کی مکمل وضاحت کے ساتھ گفتگو کے حقیقی مفہوم کی نشاندہی لازمی ہے تاکہ کسی غلط فہمی کا امکام ہی نہ رہ جائے۔ گفتگو درحقیقت مباحثہ (debate) نہیں ہے کیونکہ مباحثہ میں شریک دونوں گروہ اپنے اپنے موقف کی حقانیت اور مد مقابل موقف کی تردید میں سرگرم رہا کرتے ہیں۔ اسی طرح گفتگو درحقیقت مماشات یعنی ہاں میں ہاں ملانا (to walk together) اور تنازل یعنی اپنے مسلک سے دستبرداری بھی نہیں ہے کیونکہ گفتگو میں شامل کوئی بھی گروہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ مد مقابل کی خوشی کے لئے اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں سے دستبردار ہوجائے بلکہ وہ اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں پر مکمل ایمان واعتقاد کے ساتھ ان امور کے سلسلے میں تفاہم کا خواہاں ہوتا ہے جو دونوں جماعتوں کے لئے مشترکہ طور پر نگرانی کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران ان مشترکات کی مکمل نشاندہی کے ذریعہ دونوں جماعتوں کے درمیان باہمی تعاون کی راہ ہموار کی جاتی ہے تاکہ شدت اختلاف میں خود بخود کمی واقع ہوجائے۔

سرد جنگ کے اختتام اور عالمی سطح پر مشرقی اشتراکی بلاک کے بکھراؤ کے بعد مغربی سرمایہ دارانہ نظام نے خود بخود یہ باور کرلیا کہ وہ اس معرکہ میں کامیاب ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی وکالت کرنے والے دانشوروں کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ مغربی سامراجیت نے دنیا کے تمام دوسرے مکاتب فکر پر غلبہ حاصل کرلیا ہے اور اس کی برابری کرنے والے دیگر مکاتب فکر پوری طرح ناکام ہوچکے ہیں۔ فوکویاما نے ایک پریس انٹرویو کے دوران یہ اعلان کیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں لوگ ہاتھ کی انگلی سے ووٹ نہیں دیتے بلکہ اپنے پیروں سے ووٹ دیتے ہیں۔ مشرق سے مغرب کی طرف اور شمال سے جنوب کی طرف مہاجرت کے ذریعہ لوگ مغربی آزاد خیال جمہوریت کی حمایت وطرفداری میں ووٹ ڈال رہے ہیں۔ اہل مغرب کا یہ دعویٰ درحقیقت تمدنوں

کے درمیان گفتگو جیسے موضوع سے وابستہ اور درج ذیل دو باتوں کی وجہ سے لائق غور وفکر ہے۔

۱۔ مشرق سے مغرب یعنی ترقی پذیر ملکوں ترقی یافتہ ملکوں کی طرف مہاجرت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگ نظام سرمایہ داری اور مغربی جمہوریت کو دنیا میں موجود دیگر نظام حکومت پر فضیلت دیتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامراجی ممالک نے دیگر ممالک کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے۔ واضح رہے کہ جس ترقی کی بنیاد دیگر اقوام عالم کی لوٹ کھسوٹ اور تباہی وبربادی پر منحصر ہو وہ ترقی کبھی بھی فخر ومباہات کا سرمایہ نہیں بن سکتی ہے۔

۲۔ مختلف ادیان ومذاہب اور تہذیب وتمدن کے درمیان گفتگو میں شریک جماعتوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد اور اپنے ثقافتی معیاروں کو مد مقابل عقاید واقدار سے زیادہ اچھا تصور کریں۔ پس اگر مغربی سرمایہ دارانہ جمہوری نظام اپنی فضیلت پر نازاں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس نظام کی فضیلت وبرتری کو دنیا کی دوسری قوموں پر مسلط کرنا گفتگو کے بنیادی اصولوں کی اعلانیہ خلاف ورزی ہے۔ گفتگو کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ وہ گفتگو میں شامل دوسرے دین ومذہب کے بنیادی اصول اور تہذیب وتمدن کی بنیادی قدروں کا احترام کرتے ہوئے اپنے اصولوں کو فضیلت کا حامل تصور کرے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان موضوعات اور اقدار کی نشاندہی بھی کرتا رہے جو دونوں مذہبوں اور تمدنوں کے درمیان مشترک ہیں تاکہ ان مشترکہ قدروں کو بنیاد قرار دیتے ہوئے باہمی احترام وتعاون کی فضا ہموار ہوسکے اور تباہ کن وانسانیت سوز ٹکراؤ کے بجائے آپسی اعتماد بحال اور اس تفاہم واعتماد سازی کی مدد سے بشریت کی ترقی وخوشحالی کا ماحول سازگار ہوجائے۔ اسلام جس گفتگو کا متقاضی رہا ہے اس کا مفہوم پوری طرح واضح اور اس کی سرحدیں پہلے سے معین ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں پیغمبر اکرمؐ سے منسوب یہ قول موجود ہے۔

''وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ'' (سورہ سبا آیت ۲۴)

یعنی اور ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔

ہم ایسی دنیا میں زندگی بسر کررہے ہیں جس میں مختلف ادیان ومذاہب اور ثقافت وتمدن کی پیروی کرنے والے موجود ہیں اور ان ثقافتوں کو عظمت وسربلندی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ ان کی پیروی کرنے والوں کے درمیان مثبت و پرامن رقابت کے ساتھ ہی ساتھ باہمی تعاون کا جذبہ بھی کارفرما ہو اور یہ کام بدگمانیوں کے ازالہ اور باہمی اعتماد سازی کے بغیر ناممکن ہے جس کے لئے

گفتگو لازمی ہے اور یہ گفتگو اور افہام وتفہیم کا حسین ترین انداز ہے کہ مخالف کو براہ راست مخالف کہنے کے بجائے اسے دعوت فکر دی جائے کہ بالآخر دو میں سے ایک جماعت تو گمراہ ضرور ہے تو اب سوچنا یہ ہے کہ دونوں میں سے گمراہ کون ہے؟ رسول اکرمؐ اپنی حقانیت پر مکمل اعتقاد وایمان کے حامل تھے پھر بھی انہوں نے گفتگو کے آداب وشرائط کی پیروی کرتے ہوئے خود کو مخالف کی صف میں کھڑا کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی بلکہ اپنے لئے جرم اور مد مقابل کے لئے لفظ عمل کا استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ ان کا یہ انداز گفتگو اخلاق دنیا کا عظیم شاہکار ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو پیغمبر کی اس سیرت پر عمل کرتے ہوئے ہم ایسی دنیا کی تخلیق کر سکتے ہیں جس میں جنگ وغارتگری اور تباہی ودہشت گردی نہ ہو اور دنیائے بشریت حقیقی امن وسلامتی کی راہ پر گامزن ہو اور اگر حق بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو درحقیقت یہی ''راہ اسلام'' ہے۔ والسلام

چیف ایڈیٹر

محمد حسین مظفری